گہوارہ ادب

امریکہ

کی جانب سے مجلہ "سفیر" کا دوسرا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ حق و سچ کی اس سفارت میں ہم کس حد تک کامیاب ہوئے یہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں۔ ہم نے حق و سچ کے پیغام کو آپ تک پہنچانے کے لئے "سفیر" کی مستقل بنیادوں پر اشاعت کا فیصلہ کیا ہے۔ اگر آپ ایک قلم کار ہیں اور حق و سچ کی اس جدوجہد میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں تو دیر مت کیجئے اور اپنی تحریریں و نگارشات ہم تک ارسال کریں۔

فیکس نمبر : 1 (501) 643-5058

ای میل ایڈرس :feedbackmqm@mailcity.com

رابطہ فون :

شکیل صدیقی۔۔۔ 973-375-5591 خورشید الحق۔۔۔718-939-3537

روحیل خان۔۔۔ 631-281-5351

میرے لہجے میں میرے عہد کی سچّائی ہے
میری آواز سے آواز ملائے رکھنا

اُمورِ سفارت

سرپرست	-----	ڈاکٹر خالد مقبول صدیقی
نگران	-----	عبادالرحمٰن ایڈوکیٹ
مدیرانِ اعلیٰ	-----	عمران حسین
مدیران	-----	احمد شکیل صدیقی ، خورشید الحق

☆ ═══ معاونین ═══ ☆

عطیہ نیازی، شازیہ ارشاد، سیّدہ نفیس حسن
راشد خان، تنویر اسلم، تقی کمال، طلعت اشارت

ایم کیو ایم امریکہ

بابِ سفیر

پیغامِ سفیر--------------- سینٹرل آرگنائزر امریکہ ------------- ۵

خیالِ سفیر------------- ادارہ --------------------- ۶

فکرِ سفیر

تحریکِ آزادی سے آزادی۔ایک نظر میں----- امین حیدر----------------------- ۸

خدشات وخطرات۔۔انسانی ارتقاء میں حائل رکاوٹیں۔۔۔ خورشید الحق ----------------- ۱۱

Revolution of Roses-------شازیہ ارشاد -------------------- ۱۳

ماں------------- حارث شمسی ------------------- ۱۵

ایک سچّی کہانی--------------فواد قاضی--------------------- ۱۷

آزادی کے خواہشمند----------- عمران حسین ------------------ ۱۹

فکرِ سفیر

مختاری کی مجبوری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سیدّہ نفیس حسن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۱

منطقی انجام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شکیل صدیقی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۵

نوائے سروش

اپنے دیار کی باتیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ طلعت اشارت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰

غزل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطیہ نیازی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۲

اب بھی نہ مانیں گے تو کب مانیں گے۔۔۔۔۔۔شازیہ ارشاد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۴

غزل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تقی کمال۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۶

انوکھا دیس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جنید فہمی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۰

ارضِ وفا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔طلعت اشارت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۳

پیغامِ سفیر

نئے سال کی آمد آمد ہے ۔۔۔۔ اس نئے سال کی آمد پر ہمارا عزم ہے کہ ۔۔۔۔ ہم اس نئے سال میں امیدیں جگائیں ۔۔۔۔ سیاہ راتوں کو صبح نُور بنائیں ۔۔۔۔ آج قربان کر کے ۔۔۔۔ اپنے کل کو سجائیں گے۔ کوئی ستم ۔۔۔۔ کوئی جبر ۔۔۔۔ ہمارے سفر کی تیزی نہ کر سکے گا کم ۔۔۔۔ خوشی کے راستوں پر اب نہ رہے گا کوئی غم ۔۔۔۔ یہ ہمارا عزم ہے ۔۔۔۔ ہمارا مظبوط ارادہ ہے ۔۔۔۔ ہماری گردنیں نہ ہونگی خم ۔۔۔۔ عزم سے چمکتی آنکھیں اب نہ ملیں گی نم۔

اب بھی وہی راہیں ہیں ۔۔۔۔ وہی منزل کا شوق ہے ۔۔۔۔ بس تبدیلی ہے سال کی ۔۔۔۔ لیکن نئے سال کا سورج بھی ہمارے ارادوں کو تبدیل نہ کر سکے گا۔

پاکستان سے امریکہ تک فاصلے بہت صحیح ۔۔۔۔ لیکن سفر ایک ہے اور سفیر بھی ۔۔۔۔ مقصد ایک ہے ۔۔۔۔ اور فکر بھی مثبت ۔۔۔۔ لگن سچّی ہے ۔۔۔۔ تو منزل بھی پکّی ہے۔

آج نئے سال کی آمد پر ۔۔۔۔ سفیر کا دوسرا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے ۔۔۔۔ اور پہلے شمارے کی بازگشت آپ کی باتوں میں ۔۔۔۔ سفیر کی باتیں آپ تک پہنچنا ۔۔۔۔ آپ کا حق ہے ۔۔۔۔ اور انہیں آپ تک پہنچانا ہمارا قومی فرض۔

سچ کو آپ تک پہنچانے کا ذمہ سفیر نے اٹھایا ہے ۔۔۔۔ اور یوں حق و باطل کا فرق مٹایا ہے ۔۔۔۔ ہمارا سفر جاری ہے ۔۔۔۔ فکر سے تعمیر تک ۔۔۔۔ تحریر سے تقریر تک ۔۔۔۔ اور سفر میں کامیابی مشروط ہے ۔۔۔۔ جدوجہد سے ۔۔۔۔ بے لوث جذبہ سے۔

وقت اور حالات کا تقاضا ہے ۔۔۔۔ بس ہمیں اپنے اعصاب کو مظبوط رکھنا ہے ۔۔۔۔ اور اجتماعی مفاد کے لئے اپنی ذاتی خواہشات اور جذبات کو مفقود ۔۔۔۔ ہماری منزل اب زیادہ دور نہیں ۔۔۔۔ لیکن منزل کی قربت کا سحر بھی ۔۔۔۔ ہماری بڑھتی رفتار کو متاثر نہیں کر سکتا ۔۔۔۔ اب ہم صرف اور صرف منزل پر پہنچ کر ہی دم لیں گے ۔۔۔۔ یہی ہمارا ارادہ ہے اور اپنے قائد سے وعدہ بھی۔

آخر میں تمام قارئین اور قلم کاروں کو سالِ نو کی بہت بہت مبارک باد۔

عبادالرحمٰن

سنٹرل آرگنائزر، ایم کیو ایم امریکہ

خیالِ سفیر

آپ کے ہاتھوں میں مجلّہ "سفیر" کا دوسرا شمارہ ہے اور اس مختصر مدّت میں دوسرے شمارے کی اشاعت مُمکن ہوئی ہے آپ یعنی قارئین کی حوصلہ افزائی سے اور ناقدین کی تعمیری و اصلاحی تنقید سے جس کی بدولت ہمیں اپنی غلطیاں سدھارنے کا موقع بھی ملا اور ذریعہ بھی۔

سب سے پہلے تو آپ تمام حق پرست عوام کو سالِ نو کی بہت بہت مبارک باد۔

اس نئے سال میں نئی امیدّوں' نئی باتوں' نئے ارادوں اور نئے انداز کے ساتھ آپ کے اس سفیر کی یہ پوری کوشش ہوگی کہ حق کی سفارت کو پوری دیانت اور امانت کے ساتھ آپ تک نہ صرف پہنچائے بلکہ آپ کے دلوں کی آواز اور ذہنوں کی سوچ بھی بن جائے۔

ہم ایسے وقت میں نئے سال میں قدم رکھ رہے ہیں کہ جہاں دُنیا کو معاشی' سیاسی اور سماجی مشکلات کا سامنا ہے' وہیں عالمی دہشت گردی مہذّب دنیا کے لئے مسلسل خطرہ بنی ہوئی ہے۔ "War on Terror" یا عالمی دہشت گردی کے خلاف جہاں جنگ جاری ہے وہیں عالمی ذرائع ابلاغ میں لفظ جہاد کی تعریف (Definition) اور تکرار روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔

انتہا پسند طاقتیں جہاں مذہب اور جہاد کی آڑ میں بلا تفریق رنگ و نسل معصوم انسانوں کے قتلِ عام میں مصروف عمل ہیں وہیں ترقی پسند سوچ رکھنے والی قوتیں مذہبی رواداری' مُساوات اور معاشی استحکام کے لئے پوری قوت کے ساتھ اپنا کردار ادا کررہی ہیں۔

ایم کیو ایم کا شمارہ بھی دورِ حاضر کی اُن چند ترقی پسند تحریکوں میں ہوتا ہے کہ جنہوں نے اپنی قوم کے جائز حقوق اور ان کے ساتھ روا رکھی جانے والی ناانصافیوں اور زیادتیوں کے خلاف نہ صرف آواز بلند کی بلکہ اپنے قیام کے فوری بعد ہی غربت' افلاس' بے روزگاری' ناانصافی اور جہالت کے خلاف عملی جدوجہد کا آغاز کیا۔

ایم کیو ایم نے جہاں معاشی و سماجی ناہمواریوں کو معاشرے سے دور کرنے پر زور دیا وہیں پاکستان کی نصف صدی سے کچھ زیادہ عرصہ پر محیط تاریخ میں پہلی بار Educated Leadership کا تصوّر روشناس کرایا کہ جب مُلک کے ایوانوں میں برسوں سے قابض جاگیرداروں' مذہبی چغادریوں' وڈیروں' سرداروں اور نااہل سیاستدانوں نے ایم کیو ایم کے پلیٹ فارم سے منتخب تعلیم یافتہ اور مڈل کلاس طبقہ سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کو اپنے درمیان پایا۔ یہ نہ صرف اس elite class کے لئے بڑے اچھنبے کی بات تھی بلکہ خود پاکستان کے فرسودہ نظام میں

قید ۹۸ فیصد عوام کے لئے ایک ایسا surprise تھا کہ جس کی توقع وہ اس سے پہلے نہیں رکھتے تھے۔
ملک کی معاشی ترقی' انصاف کی فراہمی' سیاسی بے یقینی کے خاتمے اور معاشرتی مساوات کے لئے ایم کیو ایم نے پاکستان میں جس "مڈل کلاس آرڈر" کو متعارف کرایا آج دنیا کی تمام ہی مہذب قومیں اور ترقی یافتہ ممالک عالمی امن کے یقینی استحکام کے لئے Middle Class Order کی ضرورت کو نہ صرف محسوس کر رہے ہیں بلکہ کھُل کر اس پر بات بھی کر رہے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایم کیو ایم کی فکر اور اس کے بنیادی فلسفہ کی کھلی جیت کہی جاسکتی ہے۔
۲۰۰۴ء جہاں نئی اُمیدیں اور خوشیاں لے کر آرہا ہے وہیں گذرا ہوا سال ہمارے لئے ماضی کا وہ پنّہ ہے کہ جس کے آئینے میں ہم اپنے مستقبل اور اس نئے سال کو بہتر انداز میں تراش سکتے ہیں۔
کسی بھی قوم کی نوجوان نسل کو کہ جو محرومی اور ناانصافی کا شکار ہو اس کے پاس دو ہی راستے ہوتے ہیں پہلا اجتماعی خودکشی کا اور دوسرا مسلسل جدوجہد کا۔ وہ نوجوان کہ جو محرومی کو مایوسی کا رنگ نہیں دیتے اور تقدیر کو بدلنے کا ارادہ رکھتے ہیں ایسے نوجوان جدوجہد اور مسلسل جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں۔
دن' مہینے' موسم حتیٰ کہ سالوں کی تبدیلی بھی ان کی سوچ' فکر' مقصد اور بُلند ارادوں پر اثرانداز نہیں ہوتی۔
سالِ نو کی آمد پر جہاں دنیا میں آباد ان ہی جیسے دیگر نوجوان جشن منا رہے ہوتے ہیں' خوشیاں بانٹ اور سمیٹ رہے ہوتے ہیں وہیں اپنی قوم کے مستقبل کی فکر لئے یہ نوجوان اس نئے سال کو کامیابی کی امیّد سے تعبیر کرتے ہیں۔۔۔ جدوجہد کو تیز کرنے کا عزم کرتے ہیں۔۔۔ کامیابی تک پہنچنے کے نئے راستے تراشتے ہیں ۔۔۔۔۔ منزل کے خدوخال وضع کرتے ہیں۔۔۔۔ اور اپنے ذہنوں میں قوم کی خوش حالی کا تصوّر بساتے ہیں۔
ہماری نیک تمنائیں اور دعائیں ایسے ہی پر عزم نوجوانوں کے ساتھ ہیں جو حق و سچ کی تحریک کے لئے اپنا قومی کردار ادا کر رہے ہیں۔ ہمیں امیّد ہے کہ یہ نیا سال پاکستان کی مظلوم قومیتوں کے لئے خوشی کی نوید لے کر آئے گا اور یقینِ کامل اس بات پر کہ بہت جلد قائدِ تحریک جناب الطاف حسین کی قیادت میں ہم منزلِ مقصود کو حاصل کرلیں گے۔
آخر میں ہم تمام قلم کار خواتین و حضرات کے بے حد مشکور ہیں کہ جنہوں نے " سفیر" کے لئے اپنی نگارشات ہمیں بھیجیں اور ان تمام قلم کار ساتھیوں سے معذرت کہ جن کی تحریریں جگہ کی کمی یا تاخیر سے موصول ہونے کی وجہ سے شاملِ اشاعت نہ ہو سکیں۔

وا سلّام

۔۔۔۔۔آپ کا سفیر۔۔۔۔۔

تحریکِ آزادی سے آزادی

ایک نظر میں

امین حیدر (شکاگو)

سلطنت کیسے ہاتھوں سے نکل گئی؟ غدر یا تحریک آزادی کیوں ناکام ہوئی؟ انگریزی حکومت کیسے قائم ہوئی اور اس کی کامیابی کے کیا اسباب ہیں؟ 1857ء کی جنگِ آزادی جسے غدر بھی کہا جاتا رہا ہے۔ انگریز مئورخ اسے محض ایک بغاوت کیوں کہتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ ایسے بہت سے سوالات ذہن میں ابھرتے رہتے ہیں جن کے جوابات مل کر بھی نہیں ملتے' ذاتی طور پر میں 1857ء کی جنگ کو تحریک آزادی ہی خیال کرتا ہوں۔ اس میں میرے مسلمان ہونے کی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ مگر بغاوت کی دلیل میں یہ بھی حقیقت ہے کہ جوں ہی کسی گاؤں یا ضلعے سے سرکش گروہ یا باغی گروہ کو ہٹایا جاتا تھا۔ وہاں سکون اور امن امان فوری طور پر قائم ہو جاتا تھا۔ اس امر کے بر خلاف ایسے واقعات بھی سامنے آتے ہیں کہ وطن پرست انگریز سے لڑتے وقت تتر بتر ہو جاتے تھے' جانی اور مالی نقصان بھی ہوتا تھا۔ مگر ان متواتر شکستوں کے باوجود وہ کہیں نہ کہیں پھر منظم ہو کر انگریز سے لڑنے پہنچ جاتے تھے جو ان کی تحریکِ آزادی کی دلیل ہے مگر اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس تحریکِ آزادی میں نہ مرکزیت تھی اور نہ ہی کبھی پیدا ہوئی۔ مرکزیت نہ پیدا ہونے کی ایک ظاہری وجہ اس وقت ہندوستان میں جذبہ قومیت کا فقدان بھی ہو سکتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو خٹک خان' نانا صاحب' ٹیپو سلطان' جھانسی کی رانی' نواب سراج الدولہ اور فیض آباد کے مولوی صاحب جیسے نامور رہنما اپنے اپنے علاقوں تک محدود تھے۔ جہاں اس بات کے شواہد ملتے ہیں کہ اس تحریکِ آزادی میں ہندو مسلم اور سکھوں نے مل کر شرکت کی' وہیں یہ بھی ثبوت ملتے ہیں کہ میر جعفر' میر صادق کے ساتھ ساتھ بے شمار ہندوؤں نے کھل کر انگریزوں کا ساتھ بھی دیا۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت کاروبار کے بہانے انگریز اتنا کامیاب ہو جاتا۔ 1600 میں ایسٹ انڈیا کمپنی ملکہ الزبتھ اول سے اجازت لے کر ہندوستان آئی اور دیکھتے دیکھتے نہ صرف اپنے مقابلے کے دیگر یورپی حریفوں کو بھگا کر کاروباری میدان میں بہت طاقتور ہو گئی بلکہ ان کی فوجی قوت میں بھی بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ ایسٹ انڈیا فوجی اعتبار سے اس قدر کامیاب کیسے ہوئی؟ اس کی ظاہری وجہ دہلی کی حکومت کی کمزوری تصور کیا جاتا ہے۔ مگر انگریز اندر ہی اندر اتنا طاقتور ہو جائے اور کسی کو کان و کان خبر نہ ہو' یہ ایک بڑا سوال ذہن میں ابھرتا ہے' اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ مسلمانوں نے سینکڑوں برس ہندوستان میں حکومت کی مگر ہندوؤں نے اسے دل سے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا تو یہ ایک فطری بات ہے۔ اس طرح ان ہندوؤں کو جو مسلمانوں کی حکومت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے' انہیں انگریزی حکومت کی صورت میں اس کا امکان نظر آنے لگا۔ ویسے بھی ہم مسلمانوں نے کبھی ہندوؤں کے دل و دماغ جیتنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگر ہماری لیڈر شپ میں ہی وژن ہوتا اور وہ اچھوت کو عزت اور برابری کا درجہ دیتے یا سکھوں کا اس وقت اعتماد حاصل کر لیتے جس وقت گرو گوبند سنگھ اپنے مذہب کے طور طریقوں اور اصولوں کو وضع کر رہے تھے۔ مطالعہ کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے وضع کردہ مذہبی اصول اسلام سے بہت قریب تھے۔ اس کے بر خلاف ان کی پوری زندگی اورنگ زیب عالمگیر اور ان کے منظورِ نظر راجے مہاراجوں سے نبرد آزما ہوتے گذری ہے۔

ان کی مسلمانوں سے صرف مذہبی غیر ہم آہنگی تھی مگر زبان و ثقافت کی کڑی سے کڑی بجڑی ہوئی تھی یہی وجہ ہے کہ آزادی کی جنگ دونوں نے مل کر لڑی اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں 1947ء تک جاری رہا۔ 1857ء کی جنگ میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کے حالات بہر حال بہت خراب ہوئے' یہ ایک ایسی عبرت ناک تاریخی حقیقت ہے جس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ کیونکہ یہ وہ حقیقت ہے کہ جس نے ہندوستان پر مسلم حکمرانی کے اس سنہرے باب کو اختتام تک پہنچایا جس کی حیثیت صرف ایک افسانے کی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے بعد سے ان کے ذہن میں ناکامیوں' رسوائیوں اور ذلت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا' اس تحریکِ آزادی میں شکست کے بعد مسلمانوں کی کمر ٹوٹ گئی' وہ نئے حالات کا شکار ہو گئے' ہندوؤں نے ان حالات سے خوب فائدہ اٹھایا۔ انگریزی تعلیم حاصل کی۔ ملازمتوں میں انہیں فوقیت حاصل ہوئی۔ کاروبار میں انہیں کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ مسلمانوں کے لئے دروازے بند کئے جانے لگے۔ سرکاری طور پر محض ہندوؤں کی تقرری کی ہدایت جاری کی جانے لگیں۔ ان حالات کی وجہ سے مسلمانوں میں نہ صرف بد دلی پیدا ہو رہی تھی۔ بلکہ انہوں نے ہندوؤں کو بھی اپنی بربادی کا ذمہ دار تصور کرنا شروع کر دیا تھا۔ انگریز حکومت کی تو سازش ہی یہی تھی کہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" ویسے بھی انہوں نے حکومت' مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہی لی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ مسلمان ہی کو اپنا دشمنِ اوّل بھی تصور کرتے تھے۔ لہٰذا ان کے لئے کسی قسم کی مراعات سے ان کے مفادات کو نقصان ہی پہنچتا۔ مسلمانوں میں بے روزگاری اور مایوسی بڑھنے لگی۔ اور چند ہی برسوں میں ملک کی سب سے خوش حال آبادی' بدحالی کی انتہا تک پہنچ گئی۔ سیاسی' سماجی' تمدنی اور ثقافتی طور پر مسلمان بہت پس ماندہ ہو گئے۔ ایسے حالات میں سر سیّد احمد خان نے مسلمانوں کو اس تنزلی کے دلدل سے نہ صرف نکالا بلکہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی بنیاد رکھ کر مسلمانوں کی شعوری دنیا میں ایک ایسا انقلاب برپا کر دیا کہ جس کی وجہ سے انہیں سرنگ میں روشنی نظر آنے لگی۔ بے شک سر سیّد احمد خان کا یہ کارنامہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا' علیگڑھ نے مسلمانوں میں نہ صرف تعلیم کی خوڈالی بلکہ ان کی شعوری تربیت کی۔ جس کی وجہ سے وہ کھویا ہوا

اعتماد ان میں واپس آنے لگا۔ جس کی وجہ سے وہ کبھی صاحبِ کمال تھے۔ اس شعوری تربیت کے ساتھ ساتھ سیاسی طور پر بھی انہوں نے پیش رفت کی۔ مسلم لیگ سے پہلے انہوں نے کانگریس میں شمولیت حاصل کی۔ گو کہ کانگریس کا بانی ایک انگریز اے ایچ ہیوم تھا اور اس کا ابتدائی مقصد فلاحی تھا نہ کہ سیاسی، مگر کانگریس بنانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا بڑا حصہ ہے۔ بلکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان کی مکمل آزادی کی تجویز سب سے پہلے حسرت موہانی نے کانگریس میں پیش کی تھی۔ اگر ہندوؤں میں گاندھی، نہرو اور پٹیل جیسے لیڈروں کے نام آتے ہیں تو مسلمانوں میں مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، حکیم اجمل خان جیسے نام بھی نظر آتے ہیں جنہوں نے کانگریس کو مظبوط اور مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ خود قائدِ اعظم ایک وقت میں کانگریس میں تھے۔ مسلمانوں کے اس خلوص اور جذبہ ایثار کے باوجود کانگریس میں ایک طبقہ ایسا رہا ہے جو مسلمانوں کا مخالف رہا ہے۔ اس طبقے کی مسلمان دشمنی اتنی شدید رہی کہ قائدِ اعظم محمد علی جناح جیسے لبرل مسلمان نے اسے محسوس کیا اور بددل ہو کر اس سے علیحدگی اختیار کی۔ اس سے پہلے انہوں نے مسلم ہندو اتحاد کی بے پناہ کوششیں کیں۔ ان کے چودہ نکات اس ضمن میں خاصے مقبول ہوئے۔ مگر کانگریسی ہندوؤں کی سازشوں اور ذہنیت نے ان کی ہر سعی کو ناکام بنا دیا۔ کانگریس میں جو ناانصافیاں مسلمانوں کے ساتھ ہوئیں آج پاکستان انہی ناانصافیوں کی دین ہے۔ اگر تاریخی حقائق کو نظر میں رکھا جائے تو مسلمانوں پر تقسیمِ ہند کی جتنی ذمہ داری آتی ہے اتنی ہی کانگریسی ہندو لیڈروں اور ہندوؤں مہاسبھا جیسی انتہاپسند جماعتوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے دور میں ہندو اور مسلمانوں کو برابر حقوق حاصل تھے اسلامی حکومت میں ہندو غلام نہیں تھا۔ اس دور میں ہندوؤں کا کبھی قتلِ عام نہیں ہوا۔ اس کے برخلاف انگریزی دورِ غلامی اور ظلم کا دور تھا۔ انگریز ہندوستان دولت لوٹنے آیا تھا۔ اس نے ہندوستان کو کبھی اپنا وطن خیال نہیں کیا۔ برخلاف اس کے مسلمانوں نے ہمیشہ اسے اپنا وطن جانا، ہندوستانی تہذیب اور ثقافت میں اپنے آپ کو سمو لیا۔ ان کی آمد سے قبل ہندوستان ٹکڑوں میں تقسیم تھا۔ اس کو متحد اور مستحکم بنانے میں مسلمانوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ آج بھی مسلمانوں کے آباواجداد وہاں مدفون ہیں۔ کتنے انگریز ہیں جو آج ہندوستان میں پائے جائے ہیں یا دفن ہیں؟ مسلمانوں نے جس انصاف اور کامیابی سے ہندوستان پر حکومت کی ہے اس کے اعترافات خود نہرو کی کتاب " Discovery of India" میں موجود ہیں۔

بہر حال حقیقتِ حال یہ ہے کہ ہندوستان کو تقسیم ہونا تھا۔ انگریز نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا۔ ویسے بھی جنگِ عظیم دوم کے بعد ان کی کالونیوں کی پالیسی میں بہت واضع تبدیلی آئی تھی۔ مگر اپنی اس پالیسی پر وہ اب بھی کاربند تھا کہ کوئی نہ کوئی فساد یا تنازعہ چھوڑ کر جاؤ، تاکہ یہ لوگ آپس میں لڑتے رہیں اور ہمیشہ ایک کمزور قوم بن کر رہیں، بالخصوص مسلمان، ایک حد یہ بھی ہے کہ پاکستان کا وجود انگریز اور ہندو انتہاپسندوں کی سازش ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان کیا تقسیم ہوا، مسلمان تقسیم ہو کر رہ گیا۔ آج پاکستان اور بنگلہ دیش کی صورت میں دو مسلم ریاستیں نظر آتی ہیں۔ دونوں ہی معاشی، سیاسی اور تمدنی اعتبار سے کمزور ہیں۔ ہم میں اتحاد اور قومیت کا آج بھی فقدان ہے۔ قومیت سے میری مراد اسلامی تشخص ہے۔ ہم انفرادی طور پر تو مسلمان ہیں۔ مگر اجتماعی اعتبار سے بنگالی، مہاجر، سندھی، پنجابی، پٹھان، بلاچی وغیرہ وغیرہ ہیں۔ تعلیمی میدان میں لوگ آگے جا رہے ہیں اور ہم پیچھے۔ جس کے لئے شائد ہمیں پھر ایک سرسیّد احمد خان کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ اگر کھلے دل سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کچھ مسلمان تقسیم کے خلاف تھے، وہیں ہندوستان کے مسلمانوں کا بڑا طبقہ ہندوؤں پر اپنا اعتماد کھو چکا تھا۔ مسلمانوں کے بے شمار سرکردہ لیڈر کانگریس کی ناانصافیوں اور زیادتیوں کی وجہ سے اس سے علیحدہ ہو رہے تھے۔ تقسیم سے پہلے ان ناانصافیوں کی طویل فہرست ہے۔ جسے رقم کرنا میرے لئے اس وقت ممکن نہیں۔ مگر ایک واقعے کی نشاندہی کرتا چلوں۔ 1935ء کے ایکٹ کے مطابق جب کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے یہ طے کیا تھا کہ جب صوبائی خود مختاری حاصل ہو جائے گی اور اپنی حکومت بنائی جائے گی تو صوبائی کانگریس کا صدر ہی صوبے کا وزیرِ اعلیٰ بھی ہوگا۔ مگر جب صوبائی خود مختاری ملی تو ہندو وزرائے اعلیٰ بنے اور کسی غیر ہندو کو وزیرِ اعلیٰ نہیں بننے دیا گیا۔ اس وقت بہار کانگریس کے صدر ڈاکٹر سیّد محمود تھے۔ انہیں وزیرِ اعلیٰ نہیں بننے دیا گیا۔ اس قسم کی ناانصافیوں اور کانگریس کے دوہرے معیار کا کچھ نہ کچھ اثر تو ہونا ہی تھا۔ اب جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ دیکھنا یہ ہے کہ آج نصف صدی سے زیادہ گذرنے کے باوجود ہم کیا کر رہے ہیں۔ کیا اپنے عمل سے ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے خلاف واقعی ایک سازش ہوئی ہے اور ایک ذہنی غلام اور بے مقصود انسان کی طرح اپنی ناکامیوں کے جواز تلاش کر رہے ہیں۔

اگر ایسا نہیں ہے تو ہم کس طرح یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ پاکستان ایک شعوری نظریہ ہے۔ اس کا وجود حقیقی بنیاد پر ہے۔ اس کا وجود ناانصافیوں کی بنا پر ہوا تھا۔ یہ ایک محاسبہ ہے جو ہم سب کو انفرادی طور پر خود کرنا پڑے گا۔ بغیر کسی پر الزام لگائے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم پاکستان کو ایسی ریاست بنائیں جو وجود میں تو ظلم اور ناانصافیوں کی وجہ سے آئی تھی مگر اس میں انصاف کا بول بالا ہو۔ تحریر و تقریر کی آزادی ہو۔ علم کا پرچار ہو۔ محبتوں کا حوالہ ہو۔ اخوت کا نمونہ ہو۔ جمہوریت کی فرلوائی ہو۔ تمدن کا شاہکار ہو۔ سائنسی ترقی کا نشان ہو۔ قانون کی بالادستی ہو اور ہر پاکستانی نغمہ سرا ہو۔

یہ میرا پاکستان ہے یہ تیرا پاکستان ہے۔

اپنے دیار کی باتیں

طلعت اشارت (فلاڈلفیا)

دیارِ غیر میں اپنے دیار کی باتیں
چلو سنائیں تمہیں حسنِ یار کی باتیں

اِدھر اُدھر کی سُنیں اور اُدھر اِدھر کی سنائیں
کبھی ہوں شہر کبھی شہر یار کی باتیں

دُھلی دُھلی سی فضائیں سجے سجے افلاک
وہ مدھ بھری سی فضائیں وہ شبنمی راتیں

کرن دمکتی ہوئی شام سے الجھتی ہوئی
چلو میں صحنِ چمن کے منظر کی سوغاتیں

سفر نصیب قدم میں ہزار زنجیریں
خیال و خواب ہوئیں وہ حسیں ملاقاتیں

وہ دن کا حسنِ گریزاں وہ میرا حسنِ گماں
نظر نواز وہ جلوے ' وہ دلنشیں گھاتیں

چمک رہی ہے بہت دور میرے دیس میں صبح
اُتر رہی ہیں مرے ذہن و دل پہ باراتیں

یہ تار تار قبائیں یہ بد نہاد لباس
لہو رلاتی ہیں دل کو نفاق کی باتیں

فرازِ عشق سے طلعتؔ فرازِ ذات تلک
جنونِ حُبِّ وطن کو یہ کس نے دیں ماتیں

خدشات و خطرات۔۔۔۔انسانی ارتقاء میں حائل رکاوٹیں

خورشید الحق (نیویارک)

یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ کسی فیصلے پر پہنچنے سے قبل سوچتا ہے اور اپنے کل سے متعلق فیصلہ کرنے سے قبل خدشات اور خطرات کا جائزہ لیتا ہے۔ شعور، لاشعور اور تحت الشعور انسان کو اس بات کی ضرورت پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اپنی سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت کو بڑھائے تاکہ وہ اپنے مستقبل کے حوالے سے آنے والے خطرات اور ذہن میں پلنے والے خدشات کی مطابقت سے اپنے لئے بہترین عملی راستے کا انتخاب کر سکے۔

ہمارے خیال میں یہ کسی بھی صحت مند دماغ اور ذہن کی علامت ہے کہ وہ تمام تر صورتحال، حالات و واقعات، ارد گرد کے ماحول اور اپنی ترجیحات کو سامنے رکھتے ہوئے بر وقت فیصلہ کرے اور خدشات و خطرات کو کسی صورت غالب نہ آنے دے۔

یہ ساری چیزیں practice پر منحصر ہوتی ہیں یعنی جو انسان جتنا زیادہ اپنے Brain Cells کا استعمال کرے گا اسی طور اس کی صلاحیتوں میں نکھار آئے گا۔ وہ نہ صرف اپنے آج کو بہتر طور پر دیکھ پائے گا بلکہ اپنی Judgement کی بنیاد پر اپنے مستقبل کی تصویر کشی کر سکے گا۔

انسانی فیصلوں میں خدشات و خطرات یا دوسروں لفظوں میں Risk factor خاصے حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی لئے آج کی جدید دنیا میں Risk Management سے متعلق Courses نصاب میں شامل ہوتے ہیں جن کی مدد سے یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ آپ زندگی کے مختلف شعبوں اور ترقی کے مختلف راستوں میں حائل رکاوٹوں، خدشات اور خطرات کا مقابلہ کیسے اور کیونکر کر سکتے ہیں۔

صحیح اور بروقت فیصلے جس طرح انسانی زندگی کے سفر میں حائل خدشات و خطرات کے اثرات کو آہستہ آہستہ زائل کرتے ہیں اور انسان کی خود اعتمادی یا Self Confidence میں اضافہ کرتے ہیں بالکل اسی طرح خدشات و خطرات کی رو میں بہہ جانے والے انسان تباہی و بربادی کے راستے پر چل پڑتے ہیں۔ محنت، لگن، خلوص اور اپنی تمام ذہنی و جسمانی صلاحیتوں جیسے عناصر خدشات و خطرات کے مقابل آتے ہیں اور انسان جیسے ہی ان پر قدرت حاصل کر لیتا ہے تو وہ اپنے ذہن میں پلنے والے خدشات اور خطرات کو شکست دے دیتا ہے اور کامیابی کے راستوں کا ہم سفر بن جاتا ہے۔

جس طرح انفرادی سطح پر انسان اپنے مستقبل اور بقاء کے حوالے سے خدشات و خطرات سے مستقل طور پر نبرد آزما رہتا ہے بالکل اسی طرح اجتماعی سطح پر کوئی قوم بھی اپنے آنے والے کل اور اپنے بہتر مستقبل کی جدوجہد میں حائل خدشات اور خطرات کا مقابلہ کرتی ہے۔

اس مقابلے میں ہار اور جیت کا فیصلہ قوم کی جانب سے کئے گئے فیصلوں اور اس کے مثبت یا منفی اثرات کرتے ہیں یا پھر تاریخ کے صفحات کیا کرتے ہیں۔

قوموں کا ارتقاء، اس کا سفر اور اس سفر میں کامیابیوں اور ناکامیوں کا انحصار قوم کے مزاج، اس کی اجتماعی صلاحیتوں اور Decision Power پر Depend کرتا ہے۔

معاشی، سیاسی اور سماجی استحکام کو پانے کے لئے قوموں کو کئی مواقع پر دلیرانہ اور دور رس نتائج کے حامل فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ بے چینی اور بے یقینی جیسی صورتحال اور اجتماعی سطح پر موجود خطرات قوموں کے اعتماد کو متزلزل کرتے ہیں۔ ایسے وقت میں صبر و تحمل یعنی Patience رکھنے والی قومیں ہی دور رس فیصلوں کے دور رس نتائج کو حاصل کرتی ہیں اور اپنے مستقبل کو روشن کر لیتی ہیں۔

آج کی ترقی یافتہ دنیا میں فہم و ارادہ رکھنے والی قیادت Leadership اپنی قوم کے مزاج اور صلاحیتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے معاشی اور سیاسی اصلاحات Economic & political reforms کو نہ صرف ترتیب دیتی ہے بلکہ اپنی ذہانت اور پیشِ نظر حالات و واقعات کی بنیاد پر آنے والے ۲۵ سے ۵۰ سال تک کی پالیسیاں ترتیب کرتی ہے۔

جیسے جیسے ذہنوں میں علم کے چراغ روشن ہوتے ہیں ویسے ویسے ذہن میں موجود خدشات اور خطرات پسپائی اختیار کرتے ہیں اور انسانی ارتقاء میں حائل رکاوٹیں دیر بدیر دور ہو جاتی ہیں۔

غزل

عطیہ نیازی (لاس انجلیس)

جب سے کچھ فرشتوں نے مسندیں سنبھالی ہیں
شہر تو جہنّم ہیں ' اور گاؤں خالی ہیں

زر پرست لوگوں نے جنتیں کمالی ہیں
عصمتِ وطن کی بھی بولیاں لگالی ہیں

آپ کی عنایت سے غم نصیب زندہ ہیں
زندگی سے عاری ہیں ' آرزو سے خالی ہیں

مادرِ وطن کو ہم بے ضمیر کیا دیتے؟
مانگنے کے عادی ہیں ' ہم تو خود سوالی ہیں

ہم نے دل کے گوشوں میں مسجدیں بنالی ہیں
آپ جیسے لوگوں کی صورتیں سجالی ہیں

آنکھ ہی کے رستے سے آپ دل میں آئے ہیں
آنکھ ہی کے رستے سے حسرتیں نکالی ہیں

رات دن کے سپنوں میں وہ ہمارے اپنے ہیں
وہ بھی ایک سپنا ہیں' ہم بھی خوش خیالی ہیں

اُن کو آج کہنا تھا ' ہم کو آج سُننا تھا
تہمتیں لگانی تھیں ' تہمتیں اُٹھالی ہیں

حاسدوں نے عطیہ جی ! کیا عذاب ڈھایا ہے
یہ مصیبتیں آخر آپ ہی نے پالی ہیں

Revolution of Roses

شازیہ ارشاد (ڈیلاس)

۲۱ نومبر ۲۰۰۳ء کی شام جارجیا کے دارلحکومت تبلیسی کی سڑکوں پر ناچتے گاتے' ہنستے ' مسکراتے اور فتح کے جذبات سے سرشار چہرے دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کے لئے توجہ کا مرکز رہا۔ ایک روز پہلے تک ہونے والے حکومت مخالف مظاہرے آج ایک " خاموش" انقلاب" کی کامیابی کے جشن میں تبدیل ہو چکے تھے۔

جارجیا کے صدر ایڈورڈ شیورڈ ناڈزے جو تقریباً ایک دہائی تک ملک کے سربراہِ مملکت رہے بالآخر عوامی طاقت کے سامنے بے بس ہوگئے اور تین ہفتے سے ملک میں جاری آئینی بحران کے بعد انہیں اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔

۲ نومبر ۲۰۰۳ء کو ہونے والے عام انتخابات کے بعد جارجیا میں عوامی بے چینی کا شدت کے ساتھ آغاز ہوا۔ ان عام انتخابات میں ایڈورڈ شیوناڈزے اور ان کی جماعت نے کامیابی تو حاصل کی لیکن ملک کی اپوزیشن جماعتوں سمیت عوام کی اکثریت نے ان انتخابات کو محض دھونس اور دھاندلی سے تعبیر کیا اور انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کردیا۔

جارجیا کے جمہوریت پسند عوام نے اپنی خواہشات اور اپنی آواز کو دنیا تک پہنچانے اور حقیقی جمہوری نظام کے قیام کے لئے پر امن احتجاج اور جدوجہد کا راستہ اختیار کیا۔ ہزاروں کی تعداد میں مظاہریں مظاہروں اور پر امن ریلیوں کے ذریعہ ایڈورڈ شیوناڈزے پر یہ دباؤ ڈالتے رہے کہ وہ نہ صرف اپنے عہدے سے مستفی ہوجائیں بلکہ ملک میں جاری آئینی بحران کا خاتمہ بھی کریں۔

اسی دوران دنیا نے وہ منظر بھی دیکھا کہ جب سینکڑوں مظاہرین پارلیمان کے اجلاس کے دوران پارلیمنٹ کی عمارت کے اندر داخل ہوگئے اور ایڈورڈ شیوناڈزے کو اپنی جان بچانے کے لئے وہاں سے راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔

اس منظر نے یہ بات بھی واضع کردی کہ تمام تر اقتدار و اختیار کے باوجود ایڈورڈ شیوناڈزے جیسے مضبوط حکمران بھی عوامی قوت کے سامنے بالکل بے بس ہوجاتے ہیں اور عوام جب چاہیں ملک کی مقتنہ سے آمروں اور جابروں کو بھاگنے پر مجبور کردیتے ہیں۔

جارجیا کے صدر شیورڈ ناڈزے نوشتہ دیوار پڑھ چکے تھے چنانچہ اگلے ہی روز انہوں نے عوام کے غیض و غضب کے سامنے اپنی شکست کو استعفیٰ کی شکل میں قبول کرلیا۔

ان کے استعفیٰ کی خبر سن کر جارجیا کے غیور اور جمہوریت پسند عوام سڑکوں پر نکل آئے --- ہر طرف روشنی کا سماں تھا۔۔آسمان پر آتش بازی کے خوبصورت مناظر تھے۔

ایسا لگتا تھا کہ جارجیا کے عوام کو ایک نئی آزادی نصیب ہوئی ہے۔

خوشی اور کامیابی کے جذبات سے مغلوب مرد' خواتین' بوڑھے اور بچے ایک آواز ہو کر یہ نعرے لگا رہے تھے"Re-birth of Georgia" ' "Revolution of Georgia" اور "Long- Live Georgia"۔

دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ نے جارجیا میں رونما ہونے والی اس بڑی تبدیلی کو "Revolution of Roses" کا نام دیا کہ جہاں بغیر کسی تشدد اور ہلاکت کے عوامی خواہشات' جذبات اور احساسات کو فتح نصیب ہوئی۔

آج جہاں دنیا بھر کے مختلف حصوں اور خطوں میں نظام اور طرزِ حکومت کی تبدیلی کی نہ صرف خواہش موجود ہے بلکہ اس خواہش کی بنیاد پر وہاں جدوجہد بھی جاری ہے۔

جارجیا میں رونما ہونے والی اس تبدیلی نے خواہش کو جدوجہد اور پھر جدوجہد کو کامیابی سے رنگ دیا' وہیں یہ پیغام بھی کہ جب عوام متحد اور منظم ہو جائیں تو پھر فرسودہ نظام اقتدار اور اختیار رکھتے ہوئے بھی بے بس ہوجایا کرتے ہیں اور عوامی طاقت کے سامنے بالآخر ڈھے جاتے ہیں۔

اب بھی نہ مانیں گے .....

شازیہ ارشاد (ڈیلاس)

میرے قائد کی صدا
حق کی صدا ' ایسی صدا
جس نے پھیلادی جہاں بھر میں
صداقت کی وباء
جس کے چہرے پہ جھلکتی ہے
محبّت کی ضیاء
جس کے ہونٹوں پہ مچلتی ہے
فقط سچ کی ندا
جیسے جیسے اس سیاہ رات کا ہر ظلم بڑھا
میرے قائد کی صداقت کا دیا تیز ہوا
تند ہواؤں میں بھی جلتا ہی رہا جلتا ہی رہا
حق کا سچّائی کا الفت کا عزائم کا دیا
اور جب ظلم کا اندھیرا ہوا حد سے سِوا
اس کو سچّائی کی کرنوں سے پھر مِٹنا ہی پڑا
اور کیا ہوگا ثبوت اس سے بڑا کوئی بھلا
" اس کے اخلاص و عزائم پہ تو راضی ہے خدا"
یہ زمانے کے خدا اس کا کیا بگاڑیں گے
یہ بھلا اب بھی نہ مانیں گے تو کب مانیں گے

غزل

(تقی کمال، فلاڈیلفیا)

انکساری کے نئے ڈھنگ سکھائے جائیں
ہاتھ دشمن سے بھلا کیوں نہ ملائے جائیں

زہر آلود دھویں کیسے بجھانے جائیں
کب تک خوں میں اپنے ہی نہائے جائیں

فیصلے سارے حقیقت پر اگر ہوں مبنی
پھر بھلا لوگ کیوں زنداں میں رُلائے جائیں

رہبرِ قوم کے ہاتھوں میں ہی گر ہو کشکول
کیسے اس قوم میں خود دار بنائے جائیں

اپنی ہی ذات کے محور میں مقیّد کیوں ہو
کام ہر شخص کو دوچار بتائیں جائیں

کیسے ممکن ہے کہ خالی وہ دُعاؤں سے رہیں
ہاتھ دل سے جو بعد عجز اٹھائے جائیں

ایک سچّی کہانی

فواد قاضی (ڈیٹرائٹ)

یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب ریحان' فیضان اور احمر پانچویں کلاس کے طالبِ علم تھے۔ ایک روز جب کلاس ٹیچر نے کلاس کے تمام ہی بچوں سے ان کی ترجیحات جاننی چاہیں کہ وہ بڑے ہو کر کیا بننا پسند کرینگے؟ ۔۔۔۔۔ وہ زندگی میں کیا بننا چاہتے ہیں؟ تو کلاس کے تمام ہی بچوں نے اپنے اپنے انداز میں اپنے مستقبل کی تصویر کشی کی اور جب باری ریحان' فیضان اور احمر کی آئی تو ریحان اور فیضان نے کلاس کے بہت سے دوسرے بچوں کی طرح انجنیئر اور کامیاب ڈاکٹر بننے کی خواہش ظاہر کی لیکن جب باری کلاس کے سب سے ہونہار طالبِ علم احمر کی آئی تو اس کا جواب سن کر تمام بچوں کی طرح خود کلاس ٹیچر بھی حیران رہ گئیں کہ احمر نے یہ کیا کہا کہ وہ " بس ایک اچھا انسان بننا چاہتا ہے "۔

دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ریحان' فیضان اور احمر نہ صرف اپنی جوانی میں قدم رکھتے گئے بلکہ ان کی دوستی پہلے سے زیادہ مضبوط ہوتی چلی گئی۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ جب تینوں نے میٹرک کے امتحان کو امتیازی نمبروں میں پاس کیا مگر ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اپنے ہی دوستوں سے آگے رہا اور میٹرک کے نتائج میں وہ شہر بھی میں تیسری پوزیشن پر تھا۔

یوں تینوں ہی دوستوں کو شہر کے سب سے بہترین کالج میں داخلہ بھی مل گیا اور پلک جھپکتے میں ان کا لڑکپن کادور سنجیدگی میں بدل گیا۔

بس انہی دنوں شہر کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔۔۔۔۔ آئے دن کی گرفتاریوں' چھاپوں اور ہلاکتوں کی خبروں نے جیسے شہر کے مکینوں کو خوف اور دہشت میں مبتلا کردیا تھا ۔۔۔۔۔ ہر کوئی سہم گیا تھا ۔۔۔۔۔ ڈر نے جیسے دلوں میں مستقل گھر کر لیا تھا۔

احمر جو پہلے ہی سے نہایت حساس طبیعت کا مالک تھا اور جس کے دل و دماغ میں یہ تصوّر بہت اچھی طرح واضع تھا کہ اچھا انسان وہی ہوتا ہے کہ جو مصیبت کے وقت دوسروں کے کام آئے ۔۔۔۔۔ اپنی قوم کے درد کو اپنا درد سمجھے ۔۔۔۔۔ اور اپنے کل کو قوم کے لئے وقف کردے۔

اپنے شہر کے لوگوں کے ساتھ یہ زیادتیاں اور ناانصافیاں اس کو دن رات بے چین کررہی تھیں ۔۔۔۔۔ بس ایسی ہی ایک بے چین کردینی والی رات اس نے اپنی زندگی کا وہ اہم فیصلہ کرلیا ۔۔۔۔۔ شائد اس کی یہ بے چینی اسی فیصلے پر پہنچنے کی متلاشی تھی اور اس کے ساتھ ہی بہت دنوں بعد اسے سکون کی نیند آئی۔

وہ جب صبح اٹھا تو نہائت ہشاش بشاش تھا۔ ہمیشہ کی طرح صبح صبح کالج پہنچ کر اس نے اپنے ساتھی طلبا سے ملاقات کی مگر اس بار یہ ملاقات اس کے ساتھ رہنے والے تمام ہی طالبِ علموں کے لئے انتہائی مختلف اور حیران کن تھی۔ احمر نے پہلی بار تعلیمی موضوع سے ہٹ کر بات کی تھی۔ اس نے اپنے تمام ہی ساتھیوں کو شہر میں ہونے والی ریاستی دہشت گردی اور بربریت سے آگاہ کیا اور انہیں یہ سمجھایا کہ ایک اچھے انسان کے کیا فرائض ہیں ۔۔۔۔۔ ایک اچھے انسان کی کیا ذمّے داریاں ہوتی ہیں اور ایک اچھے انسان ہونے کے ناطے ان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر اپنی قوم پر ہونے والے ظلم پر کم از کم آوازِ احتجاج ضرور بلند کریں۔

آہستہ آہستہ احمر اپنے ساتھیوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگیا کہ طالبِ علم ہی قوم کا مستقبل ہوتے ہیں اور اگر قوم کا مستقبل تاریک نظر آرہا ہو تو پھر طلباء برادری کو قوم کا ہراول دستہ بن جانا چاہئے۔ احمر کی یہ کوشش رنگ لانے لگیں اور اپنی ذات اور خواہشات میں قید بیشتر طلباء ذات کی زنجیروں کو توڑ کر احمر کے ساتھ شامل ہوتے گئے' یہاں تک کہ کالج کے اساتذہ بھی ڈھکے چھپے لفظوں میں ہی سہی لیکن احمر کے خیالات اور اس کی فکر سے متفق تھے۔

شہر میں ریاستی دہشت گردی روز بروز بڑھتی ہی جارہی تھی' پھر اِک روز احمر نے کالج میں یہ اعلان کردیا کہ وہ شہر میں ہونے والی

زیادتیوں اور ناانصافیوں کے خلاف طالب علموں کا ایک مظاہرہ کرنے جارہا ہے۔
احمر اور اس کے ساتھی انتہائی مطمئن تھے کہ مظاہرہ بالکل پر امن ہوگا اور ہم اپنا مئوقف بھی آسانی سے لوگوں تک پہنچا کر اپنا فرض ادا کریں گے لیکن شاید قدرت بھی احمر اور اس کے ساتھیوں کا امتحان لینا چاہتی تھی۔
اگلے روز مظاہرے میں کئی سو طالبِ علم شریک تھے کہ جنہوں نے ہاتھوں میں پلے کارڈز اٹھا رکھے تھے کہ جن پر ریاستی ظلم و جبر کے خلاف نعرے درج تھے۔ کچھ ہی دور کالج کے کم و بیش تمام ہی اساتذہ بھی وہاں موجود تھے جو اپنے طلباء کی خاموش حمایت اور شہر میں برپا قیامت پر خاموش احتجاج کررہے تھے۔
ابھی احمر نے اپنی تقریر شروع ہی کی تھی اور وہ اپنے ساتھی طلباء سے مخاطب تھا کہ اچانک ہی وہاں قانون نافذ کرنے والے اداروں کے سینکڑوں اہلکار آن پہنچے ۔۔۔۔۔ پھر وہی ہوا کہ جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے ۔۔۔۔۔ پُر امن مظاہرہ پُر تشدد احتجاج میں تبدیل ہوگیا۔
گرفتاریاں ہوئیں ۔۔۔۔۔ آنسوگیس کا استعمال ہوا ۔۔۔۔۔ لیکن ساتھی طلباء احمر کو وہاں سے حفاظت نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔
اگلے دن سرکاری خرچہ پر چلنے والے تمام ہی اخبارات میں یہ سرخیاں نمایاں تھیں ۔۔۔۔ " ملک کی سلامتی کے خلاف بات کرنے والے طلباء کا مظاہرہ کچل دیا گیا "
" پُر تشدد عناصر کا اجتماع ناکام ۔۔۔۔۔ قانون نافذ کرنے والوں کی بروقت کارروائی "
اس کے ساتھ ہی ملک کی سلامتی کے ذمّے دار افسران کے یہ بیانات بھی اخبارات کی زینت بنے۔
"یہ طلباء دراصل انارکی پھیلانا چاہتے تھے "
" ملک کی سلامتی کے خلاف بات کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں گے "
" گرفتار طلباء کے خلاف مقدمات چلائے جائیں گے "
اس کے ساتھ ہی احمر کی تلاش بھی شروع ہوگئی اور اس کو مفرور قرار دے دیا گیا۔ ان تمام تر حالات و واقعات اور شہر کی بگڑتی صورتحال کے پیشِ نظر احمر کو اپنا گھر اور کالج دونوں ہی چھوڑنے پڑے ۔۔۔۔۔ جہاں اس کا اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں سے ناطہ ٹوٹا تو وہیں ایک ہونہار طالب علم اپنی تعلیم کا سلسلہ مزید آگے جاری نہ رکھ سکا۔
اپنی قوم اور اپنے شہر پر ہونے والے ظلم و نا انصافی پر احمر نے کئی دوسروں لوگوں کی طرح اپنی جد و جہد جاری رکھنے کا فیصلہ کیا، جیسے جیسے وہ اپنے کام کو مزید بڑھاتا گیا اور مختلف ذرائع سے ریاستی جبر کے خلاف اپنی بات لوگوں تک پہنچاتا رہا ۔۔۔۔۔ ریاستی اداروں کے نزدیک وہ مزید خطرناک ہوتا چلا گیا۔
پھر ریاست نے احمر کو حق و سچ کہنے کی انتہائی بھیانک سزا دی۔۔۔ جب ایک روز صبح شہر کے تمام ہی بازاروں اور مصروف سڑکوں پر یہ پوسٹر چسپاں تھے۔۔
"احمر علی خطرناک دہشت گرد اور ملک کا غدار ہے " ۔۔۔۔۔" سر کی قیمت ۱۵ لاکھ روپے"
پھر احمر کے رشتہ دار اور اس کے گھر والے ریاستی اداروں کے عتاب کا نشانہ بنے ۔۔۔۔۔ چھاپے، گرفتاریاں معمول کا حصہ بن گئیں۔
احمر کو مجبوراً اپنے ملک کو چھوڑنا پڑا اور جلا وطنی کی زندگی گذارنے کے لئے قسمت اسے امریکہ تک لے آئی۔ یہاں آکر بھی احمر نے قومی فرائض سے ایک لمحہ کے لئے غفلت نہیں برتی اور قوم کے جائز حقوق کے لئے کام جاری رکھا۔
وقت تیزی کے ساتھ گذرتا رہا اور احمر اب امریکہ میں اپنی قوم کے لوگوں کو ایک جگہ جمع کرنے میں مصروف عمل تھا ۔۔۔۔۔ وہ مختلف اجتماعات اور چھوٹی بڑی میٹنگز میں اپنے لوگوں کو ان کے شہر پر گذرنے والی قیامت کی روداد بتاتا رہا۔
ایک ایسے ہی دن ۔۔۔۔۔ ایسے ہی اجتماع میں حیرت انگیز طور پر احمر کی ملاقات اپنے بچپن کے دوستوں ریحان اور فیضان سے ہوئی۔ ریحان ایک امریکی فرم میں انجینئر جب کہ فیضان ایک کامیاب نیورو سرجن بن چکا تھا۔
دونوں ہی احمر سے مل کر بےانتہاخوش ہوئے اور اس پر گذرنے والی قیامتوں پر اظہارِ افسوس کرنے کے بجائے دونوں نے احمر کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا اور اپنی قوم کے لئے اس کی خدمات کا برملا اعتراف کیا۔
اس ملاقات کے بعد احمر جب رات سونے کے لئے لیٹا تو وہ پہلے سے زیادہ مطمئن تھا کہ وہ ایک ڈاکٹر اور انجینئر نہ سہی لیکن ایک اچھا انسان ضرور ہے جو اپنی قوم کے بہتر مستقبل کے لئے اپنے مستقبل کو قربان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہی اس کے نزدیک سب سے بڑی کامیابی اور انسانیت کی خدمت ہے۔

آزادی کے خواہشمند

عمران حسین (لاس اینجلیس)

چین کے صدر ہو جنتاؤ (Hu Jintau) نے گذشتہ دنوں یہ بیان دیا کہ "تائیوان نے اگر آزادی کا باقاعدہ اعلان کیا تو اسے مکمل جنگ سے تعبیر کیا جائے گا"۔

اسی دوران چینی وزیرِ اعظم کے دورۂ امریکہ کے موقع پر امریکی محکمۂ خارجہ کے ترجمان کا یہ بیان بھی منظر عام پر آیا کہ "امریکہ تائیوان کی جانب سے مکمل آزادی کی جانب پیش رفت کے لئے کسی بھی ممکنہ فیصلے کی حوصلہ افزائی ہرگز نہیں کرے گا"۔

بیانات اور جوابی بیانات کا سلسلہ اور تائیوان کے حوالے سے جاری تنازعہ نے اس وقت شدت اختیار کی کہ جب تائیوان کے صدر چین شوئی بیان (Chen Shui-bian) نے ملک میں جاری انتخابی مہم کے دوران اس بات کا برملا اعلان کیا کہ دوسری مدت کے لئے صدر منتخب ہونے کی صورت میں وہ تائیوان کی آزادی کے لئے عوامی ریفرنڈم کا انعقاد کرائیں گے۔

انہوں نے اپنے تمام ہی انتخابی جلسوں میں تائیوان کی مکمل آزادی اور خود مختاری پر زور دیا اور عوامی خواہشات اور جذبات کے پیشِ نظر تائیوان کی آزادی کے انتہائی حساس مگر اہم معاملے کو اپنی انتخابی مہم کا مرکزی نقطہ بنایا۔

تائیوان جسے چین اپنا حصہ سمجھتا ہے اور اُسے اپنے سے جدا ہونے والا ایک صوبہ قرار دیتا ہے برسوں سے جاری بین الاقوامی تنازعات میں سر فہرست ہے۔

جہاں چین بقول اس کے تائیوان پر اپنی حاکیت دوبارہ قائم کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً دباؤ میں اضافہ کرتا ہے وہیں کسی بھی بیرونی جارحیت سے تائیوان کو محفوظ رکھنے کے لئے امریکہ برسوں سے اپنا اہم کردار ادا کرتا رہا ہے اور تمام تر چینی مخالفتوں کے باوجود تائیوان کی سفارتی اور فوجی امداد کر رہا ہے۔

یوں تائیوان کی مکمل آزادی اور خود مختاری کا معاملہ جہاں تائیوانی اور چینی حکومتوں کے درمیان شدید کشیدگی کا باعث رہا ہے وہیں دُنیا کی دو بڑی طاقتوں چین اور امریکہ کے مابین سفارتی چپقلش کا سبب بھی۔

تائیوان کے عوام کی جانب سے کی جانے والی آزادی کی جدوجہد دُنیا میں آزادی کی تحریکوں سے قدرے مختلف ہے کہ جہاں تائیوان کے عوام کو کسی تعدّدیاریاستی ظلم و جبر کا سامنا تو نہیں لیکن وہ بیرونی جارحیت کے منڈلاتے مستقل خدشات و خطرات سے مکمل آزادی بھی چاہتے ہیں اور اپنی قومی خود مختاری بھی۔

تائیوان کی قدیم تاریخ یہ بتاتی ہے کہ وہ کبھی چین کے زیرِ حکمران رہا تو کبھی ولندیزیوں کے زیرِ قبضہ۔۔۔۔۔ کبھی پرتگیزیوں کے رحم و کرم پر تو کبھی سپانوی تسلط میں۔۔۔۔۔ کبھی فرانسیسی حاکم ہوئے تو اس کے بعد جاپانی وارد ہوئے۔ یوں تائیوان کے عوام بیرونی جارحیت اور حاکیت کے عادی ہوتے چلے گئے اور پھر دوسری جنگِ عظیم میں جاپان کی شکست کے بعد اتحادیوں (Allied Forces) کے متفقہ فیصلے کے تحت تائیوان کا نظم و نسق ایک بار پھر چینی حکام کے حوالے کر دیا گیا۔

چین کے زیرِ انتظام آتے ہی یہاں بیروزگاری' معاشی بدحالی اور بدعنوانی جیسے عفریت نے سر اٹھالیا اور تائیوان کے عوام میں جنم لینے والی بے چینی نے بغاوت کا روپ دھار لیا۔

۱۹۴۷ء کے اوائل میں شروع ہونے والی اس شورش کو دبانے کے لئے چینی حکام نے ریاستی طاقت کا بے دردی سے استعمال کیا اور تائیوان کے باشعور طلباء' ڈاکٹرز اور وکلاء سمیت ہزاروں لوگوں کو اپنے حقوق کی آواز بلند کرنے کے جرم میں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔۔۔۔۔ ہزاروں تشدد کا شکار ہوئے۔۔۔۔۔ اور ہزاروں ہی پابندِ سلاسل کر دیئے گئے۔

پھر ۱۹۴۹ء میں بدترین خانہ جنگی اور چینی کمنسٹوں کے ہاتھوں شکست کے بعد چیانگ کائی شیک (Chiang Kai-Shek) اپنے لاکھوں حامیوں کے ساتھ تائیوان کی جانب نہ صرف فرار ہوا بلکہ اپنے حامیوں سمیت یہیں سکونت بھی اختیار کی۔ یوں اگلی چار دہائیوں تک تائیوان کے عوام چیانگ کے مسلط کردہ Martial Law Regime کے غلام رہے۔ جہاں وقت کی سوئیاں بڑھتی گئیں وہیں حالات بھی اپنی ڈگر بدلتے رہے اور بدلتے حالات و واقعات کے ساتھ تائیوانی عوام کے مزاج بھی اور یوں آہستہ آہستہ بڑھتے عوامی شعور اور آزادی کی چاہ نے تائیوان پر ہمیشہ ہی سے منڈلاتے چینی خطرے کے لئے اب سوالیہ نشان کھڑے کر دیئے ہیں۔

کیا دنیا کی بڑی طاقتیں تائیوان کے مستقبل کے حوالے سے ایک رائے پر مُتفق ہو پاتی ہیں؟ اور اس دیرینہ تنازعہ کا کوئی پُرامن حل نکل پاتا ہے یا نہیں؟

اس سے بالکل قطع نظر یہ بات طے ہے کہ تائیوان کے عوام کی اکثریت اپنی مکمل آزادی اور خود مختاری کی خواہاں ہے اور یہ بات بھی بالکل طے شدہ ہے کہ آزادی ایک جذبہ ہے۔۔۔۔۔ ایک احساس ہے۔۔۔۔۔ ایک خواہش ہے اور جائز جذبات' احساسات اور خواہشات کو یوں قید رکھنا ۲۱ویں صدی میں بڑی سے بڑی طاقت کے لئے بھی ناممکن ہے۔

انوکھا دیس

(اپنے پیارے شہیدوں کے نام) جنید فہمی۔ شکاگو

نصیبِ بادِ باراں ہے
یہاں پر کون ہمارا ہے
یہاں پر کون ہے حاکم
کہ سب ہی نے ظلم ڈھایا ہے
وسیع قربانیوں کے مقتل میں
اپنے شہیدوں کو پایا ہے
عجب چہروں پہ چہرے ہیں
کہ سب نے روپ دھارا ہے
حاکم کے رتبے پر
حیوان چھُپا پایا ہے
اب کس سے کریں شکوہ؟
اب کس سے کہیں جاکر؟
سبھی میں نہاں ہم نے
فرعون کو پایا ہے
سوچوں پہ پہرے ہیں
جذبات پہ تالے ہیں
ہر رات میں پنہاں
بے نام اجالے ہیں
ہم پیار کے سوداگر
کس دیس میں رہ بیٹھے
جس طرف نظر اُٹھے
اپنوں کے لاشے ہیں
ہم کس سے کہیں جاکر
ہم کس سے کریں شکوہ؟
یہ دیس انوکھا ہے
یہ دیس انوکھا ہے

مختاری کی مجبوری

سیّدہ نفیس حسن (فلوریڈا)

میں ان آنکھوں کی صدیوں سے اسیر ہوں۔۔۔۔ یہ کیسی اسیری ہے۔۔۔۔ جس میں زندگی بھی ہے اور موت بھی اور زندگی بھی کیسی زندگی۔۔۔۔ ایک عجیب سی مدہوشی۔۔۔۔ سرشاری اور سپردگی۔۔۔۔

کہیں خوابوں کا دھندلکا ہے اور کہیں طلسماتی حقیقتوں کی تلاش۔۔۔۔ میں نے زندگی سے کبھی کوئی تمنا نہیں کی اور مطمئن بھی رہی ۔۔۔۔ زندگی دھیرے دھیرے رواں دواں ہے۔ سبک ندی کی مانند۔۔۔۔ مجھے ہمیشہ سمندروں کے مدوجذر سے خوف و دہشت رہی ۔۔۔۔ لیکن دل کے سمندر میں۔۔۔۔ میرے اندر۔۔۔۔ دل میرا دل۔۔۔۔ بس یہ سارا معاملہ ظاہر و باطن کا ہے۔ یہ محبتیں بھی انسان کو مار دیتی ہیں۔ دھیرے دھیرے دل کو ایک عجیب سی گداز اور پگھلاؤ بخش دیتی ہیں۔ اور کائینات کے ہر شے پر پیار آنے لگتا ہے۔ یہ چند لمحوں کی بات نہیں ہوتی۔ وقت اور بہت سا وقت گذر جاتا ہے۔ موسم بیتے ہیں۔ ماہ و سال دھندلکوں میں کھو چلے جاتے ہیں۔ تب ایک نئی دنیا کی تسخیر عمل میں آتی ہے۔ اور یہ دل کی دنیا ہم خود بساتے ہیں۔۔۔۔

ہماری اپنی یہ دنیا۔۔۔۔ اندر کی دنیا۔۔۔۔ باہر کی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ بظاہر ان دونوں میں کوئی بھی فرق نہیں ہوتا۔ اور ہم دوہری زندگی بھی بسر نہیں کر رہے ہوتے۔۔۔۔ بس کبھی کبھی ایسا ضرور ہوتا ہے کہ اندر کی دنیا کی طوفانی ہل چل کا عمل انسان کو باہر سے اُداس کر دیتا ہے۔ اور پھر یہ اُداسی بہت سے سوال کرتی ہے۔ ان سوالوں کے جواب ہوتے ہوئے بھی ہم مطمئن نہیں ہو پاتے۔

کیا اسیری ہے' کیا رہائی ہے۔۔۔۔؟؟۔۔۔۔

یہ قید بھی خوب ہے اور یہ قید بھی خود ساختہ۔۔۔۔ اور یہ خود ساختہ قید میرے خیالات کی سچائی کی قید ہے۔۔۔ میرے دل کے اندر ان طوفانوں کی ہے جو دل کے سمندر میں بند ہیں اور اس موتی کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو ان طوفانوں کو سکون سے آشنا کر دے۔۔۔۔

ہم تمنا کا حاصل بہت جلد چاہتے ہیں۔ مگر یہ موتی مشکل سے ملتا ہے۔ یہ نارسائی اور لاحاصل ہی تو ہے جو زمینوں کو آسمان میں پہنچاتا ہے ۔۔۔۔ یوں چاند اور تارے نگاہوں میں قدر پاتے ہیں۔۔۔۔ ورنہ زمین تو قدموں تلے وہی ہے۔ کہ جو ہے۔۔۔۔ میں نے چاند تاروں کو قدموں تلے لانے کی بھی تمنا نہیں کی۔۔۔۔ میں نے تو حاصل بھی نہیں چاہا۔۔۔۔

کان ستارے چھو سکتا ہے' راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے۔۔۔۔ سب کچھ اُوپر اور بہت بلند ہی اچھا لگتا ہے!!۔۔۔۔

(یہ نارسائی کا رومان بھی خوب ہے)

میرے اندر کی دنیا بہت وسیع ہے اور وقت کا لامتناہی سلسلہ ہے۔۔۔۔ صدیوں کے گہرے اور انمٹ نقوش ہیں جو نہ جانے کتنی تہذیبوں کے پروردہ اور یہاں دل کی تہوں میں ۔۔۔۔ یادوں کے سلسلے ہیں۔۔۔ کتابیں مٹ کر بھی زندہ رہتی ہیں۔۔۔۔ کرچی کرچی جمع کر کے ذہن جوڑا جاتا ہے اور وقت کے موتیوں میں پرو کر ہاروں کے ہار تیار کرتے ہیں۔

یادوں کے سلسلے ہیں جو ٹوٹتے ہیں اور کبھی جڑتے ہیں۔۔۔۔ کبھی ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیرتے ہیں تو کبھی آنکھوں کو خون سے بھر دیتے ہیں۔ اور یہ یادیں مٹ کر بھی دل کے نہاں خانوں میں زندہ رہتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں تہذیب کی چھوٹی چھوٹی کرچیاں۔۔۔۔ اور

اس سنگم پر صرف اور زندہ رہنے والا وقت جو فیصلے بھی کرتا ہے۔۔۔اور کبھی فیصلوں میں ظلم بھی کرتا ہے۔۔۔۔اور وقت کے فیصلے کو تسلیم کرنا انسان کی مجبوری ہے۔

بات تھی اسیری اور اسیری کے سحر کی جو چاروں طرف جکڑے ہوئے ہے۔۔۔۔اور یہ سحر۔۔۔۔اور خواب۔۔۔۔

اندر کی دنیا بہت خواب دکھاتی ہے۔۔۔۔

خواب دیکھنے سے تو کوئی نہیں روک سکتا۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زندگی کو اندر کی دنیا بہت سہارا دیئے ہوئے ہے جس میں خواب دیکھنے کی آزادی ہے۔ سوچنے کی آزادی ہے۔۔۔۔اور وقت کو اپنے انداز سے بسر کرنے کی آزادی ہے۔۔۔۔اور میں نے اس نعمت کو خوب خوب استعمال کیا ہے۔۔۔۔اور اسی لئے میں ایک انجانے کیف کی سرشاری میں مگن رہتی ہوں۔۔۔۔اپنے نشوں کی مدہوشی اور اپنی شکست کا خمار۔۔۔۔

ہم زندگی سے چاہتے کیا ہیں؟ یہ فیصلہ کرنے جب بیٹھتے ہیں تو عددی حساب کتاب غلط ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ زندگی کو برتنے کے رویہ اور اس کے خواب' یہ کسی معلوم فیصلے کے مطابق نہیں گذارے جاسکتے۔۔۔۔ یہ کیسے اور کیوں کر گذرتے ہیں بس اس کے لئے تو ۔۔۔۔ تو۔۔۔۔دل کا ایک فیصلہ ہی بہت ہوتا ہے۔۔۔۔اور یہ فیصلہ بہت مشکل اور تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔۔۔۔ کیوں کہ اس موڑ پر آکر دل کے فیصلے کو ذہن کے فیصلے دبا دیتے ہیں۔۔۔اور بس یہیں سے اندر کی دنیا شروع ہوتی ہے۔

جہاں ذہن کے وقت کا کوئی راج نہیں ہوتا۔۔۔۔

خواہشوں کے سمندر کو باندھنے والا ہند۔۔۔۔ذہن نہیں ہوتا۔۔۔۔آرزوؤں کے جنگل میں جگنوؤں کو مقید کرنے والے ہاتھ نہیں ہوتے۔۔۔۔ خواہشوں اور آرزوؤں کے بے انت اور بے لگام منہ زور گھوڑے ہوتے ہیں۔۔۔۔اور آپ کی اپنی بسائی دنیا !! ۔۔۔۔!!! ۔۔۔۔۔۔۔۔۔کاش یہ دنیا کبھی باہر بھی آسکے۔۔۔۔۔۔

☆☆☆☆☆

ارضِ وفا

(طلعت اشارت۔۔ فلاڈیلفیا)

مجھ کو اندیشہ لمید نذر کروں
دورِ آشوب ہے کیا اس کے سِوا نہ کروں
گُل نہ ہوں روشنیاں ' سبز رہے نخلِ وفا
اُس کا دیپ جلاؤں یہ دعا نہ کروں

اس شبِ تار میں چاند اور ستارے ٹانکوں
یا حدِ فطرتِ انساں تہو بالا کر دوں
عصبیت خیز اندھیروں میں گِھرے گھر میرے
کن چراغوں کو جلاؤں کہ اُجالا کردوں

جب بھی ملتی ہے خبر اِک نئے ہنگامے کی
مجھ کو آتا ہے تری صبحِ درخشاں کا خیال
شہرِ دلدار کی گلیوں میں درِ جاناں پر
چاندنی رات کی بکھری ہوئی افشاں کا خیال

جب در و بام پہ چنگاریاں گرتی ہیں ترے
جب خبر من کے لہو رنگ سماں ملتی رہے
جب بھی ناگفتہ حوادث کوئی دہراتا ہے
خرمنِ جاں پہ مرے برق تپاں گرتی ہے

یہ تری حد یہ مری حد ' یہ ترا گھر یہ مرا گھر
سنگ در سنگ بنی حرص و ہوا کی دیوار
ایک اِک کرکے بابِ وفا بند ہوئے
جا بجا فکر نے سنوائے اخوت کے مزار

آستینوں میں چھپے سانپوں کے پھن تو دیکھو
لپلپاتے ہیں زباں ' دادِ سخن بیچتے ہیں
چند سکوں کے عوض عصمت ِ جاں بیچتے ہیں
غیرت ' عزت و ناموسِ وطن بیچتے ہیں

یہ تنفر ، یہ تعصب کے گھنیرے بادل
گھر کے اٹھتے ہیں تو پھر آگ ہی برساتے ہیں
جب بھی جذبات کے بارود بھبک اُٹھتے ہیں
اپنے ہی دامنِ امید کو جھلساتے ہیں

طوقِ نفرت جو اتر جائے تو ممکن ہے اماں
زنگِ تفریق کو الفت سے اتاریں آؤ
پاسِ ایمان کہ ناموسِ وفائے شہیدا
حسنِ تقسیم کو آپس میں نکھاریں آؤ

آؤ انسانیتِ زیست کو لاحد کر دیں
وسعتِ عشق کو محدود نہ کر پائے کوئی
وقت سیلاب بھی ہے دورِ سبک گام بھی ہے
اس کی رفتار کو مسدود نہ کر پائے کوئی

نہ علاقہ نہ زباں ہو نہ کوئی فرقہ ہو
بھائی چارہ ہو محبت ہو سبھی کا ایمان
ساتھیو کچھ تو کرو خونِ شہیداں بے باق
ایکتا مثلِ حرم کیوں نہ ہو اپنی پہچان

آنکھ کھولیں مرے بچے تو بھرا گھر دیکھیں
آستیں پہ نہ ہو اپنی کسی اپنے ہی کا خوں
ہو ترا نام سماعت کے لئے حسنِ غزل
مطلعِ صبحِ چمن جب بھی ترا ذکر کروں

دل کی گہرائی سے مانگی یہ دعا نذر کروں
اور کیا ارضِ وفا ! تجھ کو بھلا نظر کروں

منطقی انجام

۔شکیل صدیق ۔

۱۳ دسمبر ۲۰۰۳ء ۔۔۔۔ ایک تاریخ ۔۔۔۔ ایک علامت بن گئی ۔۔۔۔جب خوف و دہشت کے باب کا خاتمہ ہوا ۔۔۔۔ دُنیا بھر کے ذرائع ابلاغ نے Breaking News کے حوالے سے یہ خبریں نشر کیں ۔۔۔۔ صدام حسین گرفتار ہوگئے ۔۔۔۔۔۔۔۔"

ایک تاریخ ساز دن " ۔۔۔۔ " صدام حسین اپنے آبائی گاؤں تکریت سے گرفتار " ۔

صدام حکومت کے خاتمے کے بعد جہاں عراق کے مختلف شہروں میں پُر تشدد واقعات نے عراقی عوام کو خوف زدہ کر رکھا تھا وہیں سابق حکمران جماعت " Baath Party" بعث پارٹی اور اس کے سربراہ معزول صدر صدام حسین کے دوبارہ مسندِ اقتدار سنبھالنے کا خوف اور ڈر عراقی عوام کے لئے ایک ایسے بھیانک خواب کی مانند تھا کہ جو کبھی بھی اور کسی بھی لمحے حقیقت کا روپ لے سکتا تھا۔

" Operation Iraqi Freedom " کے نام سے جاری امریکی کاروائی اور اس کاروائی کے دوران صدام حکومت کے دھڑن تختے نے جہاں وقتی طور پر عراق کی گلیوں اور محلّوں میں جشن کا سماں پیدا کردیا تھا وہیں برسوں سے صدام حکومت کے ظلم و ستم کے شکار عراقی ذہنی طور پر انجانے ڈر اور خوف کا شکار تھے۔

صدام کی آمریت نے عراقی عوام کو اس حد تک نفسیاتی طور پر اپنا غلام بنا لیا تھا کہ وہ اس حکومت کے خاتمے کے بعد بھی اس کے ظلم و ستم اور ناانصافی کے خلاف لب کشائی کرنے

ماں

(حارث شمسی)

ماں -- کتنا وقت بیت گیا ہے -- اِک اِک پَل ایسے گذارا ہے -- جیسے صدیاں -- کونسا ایسا لمحہ ہے جو تیری یاد کے بغیر بیتا ہو -- ہر خوشی -- ہر غم -- میں نے تجھے ایسے یاد کیا ہے -- جیسے خشک -- بنجر زمین -- آسمان سے مینہ برسنے کی -- فریاد کرتی ہے -- جیسے مرجھائی ہوئی کلیاں -- اپنی کھوئی ہوئی خوبصورتی کو یاد کرتی ہے -- جب جب ہنسا ہوں -- تب تب تیری مسکراہٹ یاد آئی ہے -- جب جب رویا ہوں -- تیری محبت -- تیری ممتا -- تیری آغوش -- اِک دلاسا بن کر -- میرے آنسو پونچھتی رہی ہے -- اور مجھے ہمت -- استقامت -- اور منزل پر پہنچ جانے کا انعام -- اور اس کو پالینے کا یقین دیتی رہی ہے --- اس سفر میں -- جب بھی --- کبھی -- کہیں بھی ستانے بیٹھا ہوں --- تیری آنکھوں کی چمک -- اور تجھ سے قریب رہنے کی آرزو -- اِک منزل بن کر -- میرے سامنے --- ایسا سامان باندھتی ہے -- کہ جس نے ہمیشہ -- میری تھکاوٹ -- میرے سارے دکھ -- ساری تکلیفیں دور کی ہیں !!!

ماں !!! -- تجھے یاد ہے نا -- جب میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا -- تُو -- مجھ سے -- کیسی -- دانشوروں جیسی باتیں کرتی تھی -- کیسے مجھے -- سچ کی تلقین کرتی تھی -- مجھے -- سر اٹھا کر -- باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر -- بات کرنے کا حوصلہ دیتی تھی -- کیسے -- مجھ جیسے شکست خوردہ -- کم ہمت انسان کو -- سیدھی کمر سے -- کھڑا کرتی تھی -- اور سچائی کی راہ پر -- گامزن کرتی تھی -- اے ماں !!! آج تک جتنا بھی چلا ہوں -- تو بس تیرے ہی قدموں سے -- کھڑا ہوں تو تیری ہمت سے -- دیکھتا ہوں تو تیری نظروں سے -- بولتا ہوں -- تو الفاظ تیرے ہیں -- سوچتا ہوں تو سوچ تیری ہے -- بس -- میں تو اِک جسم ہوں اور میری روح -- بس تو ہی ہے !!!

ماں !!! تجھے یاد ہے نا -- کہ جب تو نے آنسوؤں سے بھری -- آنکھوں کے ساتھ -- دل پر پتھر رکھ کر -- مجھے الوداع کیا تھا -- میری ہی خاطر -- خود کو مجھ سے جدا کیا تھا -- سات سمندر پار -- آج بھی -- تیرا -- وہ آنسوؤں سے بھرا چہرہ -- میری نظروں کے سامنے ہے -- تجھ سے دور رہ کر --

میں نے بھی بہت -- زخم کھائے ہیں -- کسی پل -- چین کی -- اِک کروٹ بھی نہیں لی ہے -- مصائب کے کیسے کیسے دریا عبور کیئے ہیں -- غیروں کی دشمنیاں -- اپنوں کی عداوتیں -- پیاروں کو کھویا -- کھلے آسمانوں کے نیچے سویا -- کبھی تو دن دن بھر -- کچھ نہ کھایا -- بس تیری ہی یاد کو -- تیری ہی باتوں کو -- تیری ہی نصیحتوں کو -- دل سے لگایا -- لیکن پھر بھی ماں -- میں جانتا ہوں -- ان تمام پریشانیوں -- مصیبتوں -- اور آلام کے باوجود -- میرا دکھ -- تیرے دکھ کے سامنے -- کچھ بھی تو نہیں -- جو کرب تو نے سہا ہے -- جو کرب تو سہ رہی ہے -- میرا دکھ اسکا عشر عشیر بھی نہیں -- بھلا -- ماں بھی کبھی -- اپنی اولاد کو دور کر کے -- کبھی سکھ سے رہ پائی ہے ؟؟ -- تیرا ہر آنسو -- میرے دل پر ٹپکا ہے -- تیری ہر ہر فریاد -- میرے کانوں میں گونجی ہے -- ماں -- میری خاطر -- میرے مستقبل کی خاطر -- تو نے غیروں سے جو سُنا -- جو سلوک برداشت کیا -- جی تو چاہتا ہے -- ہر وہ زبان کھینچ لوں -- جو تیرے خلاف بولی -- ہر وہ ہاتھ کاٹ دوں -- جو تیری عظمت کی طرف بڑھے -- ہر وہ پیر توڑ ڈالوں -- جو جو تجھے -- نقصان پہنچانے کے لئے اٹھے -- ہر وہ سر -- قلم کر دوں -- جو تیرے سامنے -- تیری بڑائی کے سامنے -- غرور بن کر اٹھا -- لیکن !!! -- لیکن کیا کروں ماں -- مجبور ہوں -- تیری ان آنسوؤں کے آگے -- جو مجھے تکلیف پہنچانے کے خیال سے -- چھلک جاتے ہیں -- مجبور ہوں -- کہ کہیں -- میرا کوئی -- جذباتی -- کوئی غلط فیصلہ -- تجھے نقصان نہ پہنچا دے -- کہیں تکلیف -- تیری پریشانی کا باعث نہ ہو -- !!!

ماں !!! -- اکثر -- یہ 'دوری سہی نہیں جاتی -- تیری ممتا سے دور رہنے کا یہ کرب -- ناقابل برداشت ہے -- اور نہ جانے کب تک -- یہ کرب سہنا ہے -- جدائی کے اس عالم -- میں رہنا ہے -- بس اِک یقیں ہے -- تیری محبت پر -- تیری ہر اس بات پر -- جو تو نے مجھے سکھائی -- مجھے پڑھائی -- یقیں ہے -- اس منزل پر پہنچنے کا -- کہ جس کا راستہ -- تو نے دکھایا -- یقیں ہے اس کو پا لینے کا -- کہ جس کا خاکہ -- جس کا تصور -- تو نے دیا -- اور ان سب کے ساتھ ساتھ -- سب سے ماورا -- یقیں اس بات کا -- کہ میں تجھ سے پھر ملوں گا -- تیری آغوش میں -- پھر سے پناہ لوں گا -- تیرے پیاروں کے ساتھ -- اپنے پیاروں کے ساتھ -- !!! میری تو منزل بھی تو ہی ہے -- ابتداء و انتہا بھی تو ہی ہے -- یقیں ہے تو پھر -- دیر کیسی -- بس اب کچھ دیر نہیں -- کہ تیری آغوش -- تیری گود -- اور میرا سر -- !!!! ماں -- اے میری ماں -- میری تحریک !!!!!!

سے ہر ممکن اجتناب برت رہے تھے۔

ظلم و تشدد اور قتلِ عام جیسے ہتھکنڈوں نے صدام اور اس کے حواریوں کو جہاں اپنی من مانی کرنے کی آزادی فراہم کی وہیں معصوم عراقی عوام کی جسمانی اور ذہنی دونوں ہی طرح کی غلامی کو بھی یقینی بنایا۔ تیل کے وسائل سے مالا مال عراق کے عوام پچھلی کئی دہائیوں سے غربت' افلاس اور جہالت جیسے بنیادی مسائل کا شکار تھے۔ جہاں عراقی شہروں اور قصبوں میں صدام حسین کے قد آور مجسمے آرٹ کا اعلیٰ نمونہ پیش کررہے تھی وہیں مایوسی' محرومی اور حسرت و یاس کی تصویر بنے عراقی عوام دُنیا بھر میں صدام حکومت کے مظالم کو چیخ چیخ کر پیش کررہے تھے۔

اتحادیوں کے عراق پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد جہاں صدام حسین اور اس کے حواریوں نے راہِ فرار اختیار کی وہیں یہ افواہیں بھی گردش کرنے لگیں کہ صدام حسین اتحادی فوجوں پر حملوں کے لئے پیش بندی کررہے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو پھر سے منظم کررہے ہیں۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان افواہوں نے عملی شکل اختیار کی اور پھر جلد ہی خود کش حملوں نے عراق کی فضاء اور ماحول کو خونی کردیا۔

گذرتے مہینوں کے ساتھ جہاں بعث پارٹی (Baath Party) کے اعلیٰ عہدیدار اتحادیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوتے گئے وہیں صدام کی گرفتاری کے لئے جاری مُہم کو مزید تیز کرنے کے لئے بین الاقوامی دباؤ میں اضافہ بھی ہوتا گیا۔

صدام عراق میں موجود ہیں یا بیرونِ ملک فرارہوچکے ہیں؟ عراق میں منظم ہونے والی " Resistance Force " کو صدام کی پشت پناہی حاصل ہے یا نہیں؟ صدام زندہ ہیں یا مردہ؟۔ ان ہی جیسے دیگر سوالات طویل عرصے تک بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں پوری شدت کے ساتھ زیرِ بحث رہے اور بالآخر ۱۴ دسمبر ۲۰۰۳ء کی صبح کئی ماہ چلنے والی یہ بحث اپنے منطقی انجام کو پہنچی اور اس کے ساتھ ہی عراق پر مسلط خوف و آمریت کا باب بھی --------